© rasailojaraid.com

رُوداد ابتلاء : احمد رائف مصری

ترجمہ جناب خلیل الحامدی

[۱۹۶۵ء میں جب سید قطب اور اخوان المسلمون کے دیگر افراد کو جمال عبد الناصر کی حکومت نے گرفتار کیا تھا، اُن میں ایک صاحب احمد رائف بھی تھے جو ۱۹۷۲ء تک جیل میں رہے۔ رہائی کے بعد انہوں نے اپنے ایام اسیری کے حالات کتابی صورت میں شائع کیے ہیں۔ کتاب کا نام "البوابۃ السوداء" (سیاہ دروازہ) ہے۔ ذیل میں اسی کتاب کا ترجمہ "روداد ابتلاء" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔ مترجم]

"صرف پانچ منٹ...... ابھی ہم واپس آجائیں گے"۔

میجر محمد عبد الغفار نزک نے مجھے گھر سے گرفتار کرنے کے بعد یہ الفاظ کہے۔ ۲۵۔ اگست ۱۹۶۵ء کی صبح کو یہ گرفتاری عمل میں آئی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میجر کا رویہ میرے ساتھ شریفانہ تھا۔ اس کٹھن دن کا سورج چڑھنے کے ساتھ ہی اُس نے مجھے قلعہ کی حوالات (جس میں سیاسی نظربند رکھے جاتے ہیں) کے سپرد کر دیا۔

میں امریکی مصنف جان چاٹنک کا ڈرامہ: "آدمی اور چوہے" پڑھ کر فارغ ہی ہوا تھا۔ رات کا ایک بجا چاہتا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ رات کے اس ہولناک سمے میں دستک دینے والے صاحب سمیر الھُضَیبی تھے۔ اُن کا چہرہ پژمردہ تھا۔ نگاہیں بھٹکی ہوئی تھیں اور وہ سراسیمگی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہم پاس پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے نئی خبریں سُنانی شروع کر دیں۔ بتانے لگے کہ ہمارے دوست یحییٰ حسین، جو عرب ایرکمپنی میں پائلٹ ہیں، خرطوم کے راستے ادیس ابابا جا رہے تھے۔ جب انہوں نے اپنا جہاز خرطوم میں اُتارا تو وہاں سے وہ یکایک غائب ہو گئے ہیں ـــــ یہ خبر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سُننے ہی مجھ پر سراسیگی چھا گئی - میں نے سوچا یہ ہمارا دوست یحییٰ حسین، جس نے زرعی کالج سے فراغت حاصل کی، پھر شہری ہوا بازی کے انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہوا اور پائلٹ بن گیا - اُسے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی - کالج کی ایک ہم سبق لڑکی کے ساتھ اُس نے شادی کرلی - اب اُس کے ہاں دو پیاری سی بچیاں ہیں - اُن میں سے ایک کا نام میری یادداشت کے مطابق سمیّہ ہے - یہ نوجوان بڑی پُرسکون زندگی بسر کر رہا تھا - کوئی بات اُس کے عیش کو منغّص کرنے والی نہ تھی - میرے علم کے مطابق اُسے کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا......

میں نے سمیر سے پوچھا: یہ خبر آپ کو کیسے معلوم ہوئی؟ اُس نے جواب دیا: میں اپنے بہنوئی محمد الغنام اور ضیا طوبیچی کے پاس بیٹھا تھا - ان لوگوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے - میں نے پھر پوچھا کہ: "یحییٰ حسین پر آخر کیا اُفتاد پڑی"؟ سمیر نے مجھے حسرت و اندوہ میں ڈوب کر جواب دیا: مجھے کچھ معلوم نہیں ہے - یہ لوگ مختلف باتیں اور قیاس آرائیاں کرتے رہے ہیں - سب سے انوکھی قیاس آرائی یہ کی گئی ہے کہ سی آئی اے نے اُسے اغوا کرایا ہے - کیوں اغوا کرایا ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہے - کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ خرطوم ایرپورٹ کے کیفے ٹیریا میں قہوے کی ایک فنجان پینے کے لیے گیا اور وہاں اُس پر یکایک بیہوشی کا دَورہ پڑ گیا، یا عارضی طور پر اُس کی قوتِ یادداشت مسلوب ہوگئی - اب بات نے ایک اور رُخ اختیار کرلیا -

سمیر نے کہا: یہ بڑی پختہ خبر پھیل رہی ہے کہ حکومت اخوان المسلمون کے لوگوں کو گرفتار کر رہی ہے - میں سوچنے لگا کہ: یحییٰ حسین کی گمشدگی کا کہیں گرفتاریوں کی خبر سے تو تعلق نہیں! بہرحال ہم اِدھر اُدھر کے تیر تکّے چلاتے رہے - اور لاحاصل تجزیے، تاویلیں اور قیاس آرائیاں کرتے رہے - اسی میں صبح کے تین بجنے لگے - میرے دوست نے مجھ سے واپس جانے کی اجازت مانگی - مجھے یہ تفکّر انگیز خبر سُنا کر وہ چلا گیا اور میں نے اپنے آپ کو نیند کے حوالے کر دیا -

تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وِیٹنگ روم میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور میری آنکھ کھل گئی - میں نے دیکھا کہ وِیٹنگ روم کی روشنی جل رہی ہے - میرا خالہ زاد بھائی رمزی، جس کے ہاں میں رہ رہا ہوں، وہاں کھڑا ہے - اور اُس کے چہرے پر دہشت، حیرت اور اضطراب کے آثار طاری ہیں - مکان کا دروازہ زور سے بجا - رمزی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا: "یہ خفیہ پولیس کے لوگ

© rasailojaraid.com

ہیں۔ اب کیا خیال ہے؟ دروازہ کھول دینے کے سوا اور کیا خیال ہو سکتا تھا۔ نیند آنکھوں سے اُڑ گئی۔ پولیس افسر اندر گھُس رہا ہے اور اُس کے سامنے سپاہیوں اور مخبروں کا ایک جتھہ ہے جنہوں نے ریوالور تان رکھے ہیں۔ میں حواس باختہ ہو گیا۔ خفیہ پولیس یہاں کیسے۔ یہ کیا چاہتے ہیں۔ کیا ان کی آمد یحییٰ حسین کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔ ان لوگوں کے پیچھے پیچھے چچا ہاشم چوکیدار بھی اندر آ گیا —— یہ چوکیدار بھی جو بالائی مصر کا باشندہ ہے، ہماری طرح کچھ نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔

رمزی نے پولیس افسر سے پوچھا: آپ کون ہیں؟

پولیس افسر: میں ہوں میجر محمد عبدالغفار ترک۔

رمزی: میں آپ کا شناختی کارڈ دیکھ سکتا ہوں؟

اس سوال پر سپاہیوں اور مخبروں کی ٹولی ہمیں بڑی غضب آلود نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ میجر نے کارڈ نکالا اور ہماری آنکھوں کے سامنے اُسے گردش دی۔ ہم اُس میں سے کوئی چیز نہ پڑھ سکے۔ ہماری نظریں ہچکچاتی تھیں اور کارڈ کی سیاہی اور سفیدی میں تمیز نہ کر رہی تھیں۔ پولیس نے چچا ہاشم کو باہر نکال دیا جو سخت پریشان تھا، اور ایک سپاہی کو حکم دیا کہ دروازہ بند کر دو۔ حیرت زدہ نگاہوں پر گو خاموشی چھا گئی تھی۔ مگر وہ اُچک اُچک کر بھی دیکھ رہی تھیں۔ سانس کی بے ترتیبی صاف سُنی جا رہی تھی۔ پولیس افسر کی آواز نے مہر سکوت توڑ دی۔ وہ میرا نام لے کر پوچھنے لگا: آپ میں سے احمد رائف کون ہے؟

میں ہوں۔

تمہارا کمرہ کونسا ہے؟

میں نے خاموشی کے سامنے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔

کمرے کی طرف منہ کر کے وہ کہنے لگا: ہم اس کی تلاشی لے سکتے ہیں؟

رمزی نے اُسے روکنے کی کوشش کی اور تفتیش کے احکام کا مطالبہ کیا۔ پولیس افسر نے ایک تلخ اور تمسخر انگیز مسکراہٹ کے سوا اور کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے رمزی کو اس بے فائدہ کوشش سے روک دیا۔

© rasailojaraid.com

تلاشی کے لیے ہم سب کمرے میں داخل ہو گئے۔ سپاہی گھر کے کونے کونے کے اندر پھیل گئے۔ میں پولیس افسر سے دریافت کرنے لگا کہ کیا میں اس تمام کارروائی کی وجہ معلوم کر سکتا ہوں؟ یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ لوگوں کو کس چیز کی تلاش ہے! میرے ذہن میں یہ مجنونانہ خیال آیا کہ شاید یہ لوگ یحیٰی حسین کی تلاش میں ہیں۔ لیکن اُسے کیوں ڈھونڈ رہے ہیں؟ خفیہ پولیس سے اُس کا کیا تعلق ہے؟ کیا یہ سب کہانی اخوان کے لوگوں کو گرفتار کرنے کے لیے تو نہیں ہے؟ پولیس افسر کے جواب پر میں چونک پڑا۔ اُس کا جواب نہایت شریفانہ لہجے میں تھا: ہم تمہاری کتابوں اور کاغذات پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں طیش میں آ گیا۔ کتابیں! میری زندگی کا سب سے مقدس ترین سرمایہ۔ میں نے انہیں نہایت محفوظ مقام پر رکھا ہے۔ انہیں چھیڑنے کی کسی کو اجازت نہیں ہو سکتی —— مجھے شدید غصہ آیا۔ مگر میں نے اُسے پی لیا۔ اور اُس وقت غصہ پی لینے کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔ ایک گھنٹہ سے زیادہ کتابوں اور کاغذوں کو اُلٹ پلٹ کیا جاتا رہا۔ اُنہوں نے مختلف علوم و فنون کی کتابوں میں سے ایک نہایت قیمتی ڈھیر چُن لیا اور انہیں موٹروں میں رکھ لیا جو نیچے مکان کے سامنے کھڑی تھیں۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ جب ہمارے گاؤں میں میرے چھوٹے بھائی کو گرفتار کرنے کے لیے گئے تھے تو وہاں بھی انہوں نے میری کتابوں کے آٹھ صندوق —— جو میں نے وہاں محفوظ رکھی ہوئی تھیں —— اُٹھا لیے تھے —— بہرحال تلاشی مکمل ہو گئی۔ میں یہ اندازہ لگانے لگا کہ اب اس کے بعد کیا ہو گا۔

اتنے میں پولیس افسر بولا:

آپ کپڑے پہن سکتے ہیں؟

کیوں نہیں۔ لیکن کس لیے؟

میجر نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا: بات کچھ نہیں ہے۔ انٹیلی جنس کے دفتر میں معمولی سی پوچھ گچھ ہو گی۔ ہم پانچ منٹ میں واپس آ جائیں گے۔ میں نے تأمل کرتے ہوئے کہا: رات کے اس آخری حصے میں؟ میجر نے اس بار ذرا شدید لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا: "جی ہاں، رات کے اسی آخری حصے میں"۔

میں سمجھ گیا کہ اب بحث فضول ہے۔ بڑے سکون کے ساتھ میں نے کپڑے پہن لیے اور مکمل سپردگی کے عالم میں میں اُس کے ساتھ چل پڑا۔ گو موسم بڑا گرم تھا مگر نہ معلوم میں نے اُون کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھاری بھرکم کپڑے کیوں پہن لیے۔

گجردم کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ موٹر نیند میں ڈوبے ہوئے قاہرہ کی سڑکیں غیر معمولی سرعت کے ساتھ طے کر رہی تھی۔ میجر ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں پچھلی سیٹ پر مخبروں کے درمیان بیٹھا اپنے انجام پر انگشت بدنداں تھا۔ دو سپاہیوں نے میری باہیں پکڑ لیں گویا اُن میں سے ایک نگران فرشتہ تھا اور دوسرا سائق۔ میرا ذہن طرح طرح کے سوالات سے اُبل رہا تھا۔ ان سوالات کا جواب حاصل کرنے میں مجھے کچھ دیر نہ لگی۔ کیونکہ سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اُن کا جواب مجھے مل چکا تھا۔ ایک ایسا دن جو میری زندگی کا سب سے زیادہ تعجب انگیز اور حیرتناک دن تھا۔

خفیہ پولیس کے دفتر میں جب ہم داخل ہوئے تو اُس وقت صبح بڑی سست رفتاری اور اکتاہٹ کے ساتھ پھوٹ رہی تھی۔ پورا دفتر سکوت کے عالم میں غرق تھا۔ بڑا وحشت انگیز دفتر تھا۔ گویا کوئی قبرستان ہے۔ پہلی نظر میں مجھے یہ ماحول ایسا ہی محسوس ہوا۔

مخبروں کے گھیرے میں مَیں گاڑی سے اُترا۔ میجر کے پیچھے پیچھے ہم چل دیے، جس نے قاہرہ کے دوسرے انسانوں کی طرح قمیص اور پتلون پہن رکھی تھی۔ شاید سڑک پر چلتے ہوئے سینکڑوں لوگوں کے ہجوم میں آتے جاتے کبھی میرا اُس سے آمنا سامنا بھی ہوا تھا۔ مگر کیا اُس روز میں یہ تصوّر بھی کر سکتا تھا کہ اِس مرنجاں مرنج شخص کے ہاتھ میں انسانوں کی تقدیریں ہیں —— جی ہاں یہ وہی مرنجاں مرنج انسان ہے جو کسی شخص کو بھی اُس کے گھر سے جب چاہے پکڑ سکتا ہے اور جہاں چاہے اُسے لے جا سکتا ہے۔ اُس کے لیے صرف ایک چھوٹا سا کارڈ دکھا دینا ہی کافی ہے۔ کارڈ بھی ایسا جسے کوئی شخص اچھی طرح پڑھ نہیں سکتا۔ مگر وہ کارڈ کیا ہے، گویا سلیمانؑ کی انگشتری ہے جس کی تاثیر سے تمام مقفّل دروازے یکایک وا ہو جاتے ہیں۔ یا وہ الٰہ دین کا چراغ ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ کارڈ دکھائے بغیر بھی جو چاہے کر سکتا ہے۔ اُسے کوئی نہیں ٹوک سکتا۔ اس سے بھی بڑھ کر تلخ حقیقت یہ ہے کہ اُن دنوں مصر کی حالت یہ تھی کہ ہر سرکاری افسر جو چاہے کر سکتا تھا۔ کوئی اُس کا حساب لینے والا یا اُس پر گرفت کرنے والا نہ تھا۔ بلکہ کوئی اُس سے سوال تک کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔

اگر کسی پولیس افسر کا کسی شہری سے کوئی جھگڑا ہے۔ وہ پولیس افسر بڑی آسانی اور بیحد سادگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ سپاہیوں کی ایک پارٹی لے کر اُس مسکین کے گھر چلا جائے گا اور اُسے گرفتار کر کے ایسی جگہ پہنچائے گا جہاں اُس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو گی۔ اور گرفتار کر لینے کے کئی ماہ بعد اُس کی گرفتاری کا معاملہ ریکارڈ پہ لایا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس مسکین کا بیان لے لیا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس کا کوئی بیان نہ لیا جائے۔ اور وہ سالوں جیل میں سڑتا رہے۔

اُن سنگین ایام میں سب سے زیادہ حیرت انگیز جو صورت پیش آیا کرتی تھی وہ یہ تھی کہ کوئی شہری جب انکوائری افسر کے سامنے پیش ہوتا تھا تو اُس سے پوچھا جاتا تھا کہ اسے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟ اُس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنی گرفتاری کا خود ہی کوئی وزنی اور معقول سبب بتائے — ایسا نہ کرنے والے کے لیے عذابِ الیم تھا — جی ہاں، ایسی ہی صورت حال سے انسان گزر رہے تھے۔

بعد میں مجھ پہ جو کچھ گذری اُسی زمانے کی بات ہے کہ میں فوجی جیل میں ملٹری انٹیلی جنس کا مہمان تھا۔ ایک روز دفتر کے باہر اپنی تفتیش کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی کو طلب کیا گیا اور متعلقہ افسر کی طرف سے اُس کی گرفتاری کی وجہ پوچھی گئی۔ اُس نے جواب دیا کہ مجھے وجہ معلوم نہیں — اور وہ بیچارہ واقعی اپنی گرفتاری کی وجہ سے بے خبر تھا — افسر تحقیق نے تعذیب دینے والے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس شخص کو ذرا مزہ چکھاؤ۔ چنانچہ پورے آٹھ گھنٹے تک اُسے کبھی کوڑوں سے مارا گیا اور کبھی گرم گرم لوہے کی سلاخوں سے داغا گیا۔ اور وہ بے چارا حقیقت حال سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ اُسے کوئی ایسا جواب اِلقاء ہو جائے جسے پیش کر کے وہ اس دوزخ سے نجات پا سکے جس کے دروازے یکایک اُس کے لیے کھول دیے گئے ہیں۔ اتنے میں مجھے ایک اور انکوائری افسر کے پاس بھیج دیا گیا۔ پھر مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ اُس بیچارے کے ساتھ کیا گزری۔

ایک اور بدقسمت انسان کی کہانی بھی سن لیجیے۔ یہ ایک ہی عمارت میں ایک فوجی افسر کے پڑوس میں رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کی بیوی اور فوجی افسر کی بیوی باہم لڑ پڑیں۔ فوجی افسر نے اس سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ چنانچہ جب ۱۹۵۴ء میں عام پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو وہ شخص بھی گرفتار کر لیا گیا۔ فوجی افسر کو انتقام لینے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ ایک مرتبہ اچانک اُس نے فوجی جیل کے صحن میں اپنے پڑوسی کو دیکھ لیا۔ چنانچہ اُس نے متعلقہ ریکارڈ میں اُس کا نام بھی درج کر دیا۔ چند ہی لمحے گذرے تھے کہ اُس شخص کو بھی دوسرے بے شمار نظر بندوں کے ساتھ فوجی ٹرک میں لاد کر فوجی عدالت (جسے پیپلز کورٹ یعنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عوامی عدالت کہا جاتا تھا بھیج دیا گیا۔ اس کی بدنصیبی میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ اُس روز فوجی عدالت کی طرف سے کسی کارروائی کے بغیر ہی ملزموں کو سزائیں سُنا دی گئیں۔ تمام ملزموں کو خوف و ہراس کی فضا میں دو قطاروں میں کھڑا کر دیا گیا۔ ایک فوجی سپاہی آیا اور اُس نے ہر قطار کے لوگوں کے نام ایک فہرست میں درج کر لیے۔ اور پھر ایک اور حوالدار آیا اور اُس نے بے ہنگم طریقے سے آواز بلند یہ اعلان کیا کہ دائیں بازو والی قطار کے اندر جو لوگ ہیں عدالت نے انہیں دس سال قید بامشقت کی سزا دی ہے۔ بائیں بازو والی قطار کے لوگوں کو مزید پانچ سال سزا بھگتنی ہو گی۔ یعنی ۱۵ سال۔ اُس روز یا اُس سے اگلے روز مذکورہ بالا فوجی افسر کا مسکین ہمسایہ لیمان طرہ کی جیل میں ڈال دیا گیا جہاں وہ برسوں جبلِ مقطم کے دامن میں سورج کی شدید تمازت کے اندر پتھر توڑنے کی مشقت سرانجام دیتا رہا۔

خیر...... ہم ۲۵ اگست ۱۹۶۵ء کی صبح کا ذکر کرتے ہیں۔ ہم ملٹری انٹیلی جنس کے دفتر میں پہنچ چکے تھے۔ میجر اور اس کے جملہ سپاہی پھرتی کے ساتھ سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ تھا مگر میرے قدم بھاری ہو رہے تھے۔ میں قلق و اضطراب میں مبتلا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی ایسے انجام کی طرف بڑھ رہا ہوں جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔ اس وسیع و عریض عمارت کے اندر ایک انسان بھی نظر نہ آرہا تھا۔ کیا یہی انٹیلی جنس کا مرکز ہے جس کا نام سنتے ہی بہادر سے بہادر انسان کا پتہ بھی پانی ہو جاتا ہے۔ میں نے میجر کو چیخ کر کہا: تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو۔ اور کیوں لیے جا رہے ہو؟

میجر نے میری چیخ و پکار پر کوئی کان نہ دھرا۔ وہ اب اور ہی انسان بن چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک تو وہ مجھ سے بڑی نرمی اور مٹھاس سے بات کرتا تھا۔ مگر اب اُس کا طرز بدل چکا تھا۔ وہ مجھے دو محافظوں کے حوالے کر کے خود ایک کمرے میں چلا گیا۔ میں دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ خاموش اور مضطرب۔ میرے تصور میں یہ تھا کہ یہ اتنی بڑی بلڈنگ "بے رحم پہرہ داروں" اور "شہاب ثاقب" سے بھری ہوئی ہو گی۔ مگر اب وہاں ایسی کوئی چیز دکھائی نہ دے رہی تھی۔ تاہم میں سوچ رہا تھا کہ یہ خوفناک سناٹا یقیناً اپنے اندر کوئی بات پنہاں رکھے ہوئے ہے، جس کی تہ کو میں نہیں سمجھ رہا ہوں، اور میری اُس وقت کیا حالت ہو گی جب چاروں طرف سے میرے اوپر بلائیں ٹوٹ پڑیں گی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نے ایک پہرہ دار کو دیکھا کہ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ میں نے اس سے بےخودی کے عالم میں یہ سوال کر ڈالا :

کیا وہاں تعذیب دی جاتی ہے ؟

کہاں ؟

جہاں تم مجھے لیے جا رہے ہو ؟

پہرے دار نے مجھے تھکی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کہا : کیا تم پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے ہو ؟ اب بات کھل کر میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ مگر سبب گرفتاری کیا ہے ؟ کچھ نہیں معلوم۔ "گرفتاری" کا لفظ میرے کانوں کے لیے سخت غیر مانوس تھا۔ اب میں نے اس صورتِ حال کا گہرا جائزہ لینا شروع کیا۔ میجر نے کہا تھا کہ پانچ منٹ میں واپس آنے ہیں۔ مگر اس کی یہ بات درست نہیں ہے۔ پہرہ دار کی آواز پر میں پھر چونکا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بہر حال آپ مت گھبرائیں۔ میں نے کہا : کیوں نہ گھبراؤں ؟ کہنے لگا : معمولی مار دی جائے گی۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ اس پھندے سے میں کیسے نکلوں۔ معمولی مار ؟ معمولی مار اور غیر معمولی میں کیا فرق ہے ؟ اس وقت تک میں معمولی مار اور غیر معمولی مار میں فرق نہ کر سکا تھا مگر بعد میں میں سمجھ گیا کہ "معمولی مار" اور "غیر معمولی مار" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آئندہ میں بتاؤں گا کہ یہ کیا فرق ہے۔

میجر جس کمرے میں داخل ہوا تھا مجھے بھی اسی کمرے میں داخل کر دیا گیا۔ مجھے بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے صبح کی نماز پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مجھے یہ اجازت دے دی گئی۔ میں نے میجر سے قبلے کا رخ دریافت کیا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مجھے یاد آگیا کہ ایسے موقع پر جس سمت بھی مجھے اطمینان ہو جائے میں نماز پڑھ سکتا ہوں۔

میجر نے ان تمام کتابوں اور خطوط اور بعض مقالات کی، جو میں نے تاریخ اسلامی کے بارے میں لکھے تھے اور میری جائے نیام سے قبضہ میں لے لیے گئے تھے، ایک فہرست تیار کی۔ پھر مجھے قلم تھماتے ہوئے کہنے لگا کہ اس فہرست پر دستخط کر دو۔ میں نے دیکھا کہ جو کتابیں اس نے میرے ہاں سے اٹھائی تھیں ان میں سے اکثر اس فہرست میں درج نہیں ہیں۔ میں نے کوئی توجہ نہ دی اور پورے سکون اور دلجمعی کے ساتھ اس پر دستخط کر دیے۔ چند منٹوں کے بعد ہم دوبارہ گاڑی میں سوار ہو گئے اور

(دیکھیے صفحہ ۴۸)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(بقیہ اشارات)

اور انسانوں کے جمہوری حقوق کی بحالی کا دعویٰ لے کر اُٹھے اور لوگ اُس کے اِس دعوے پر یقین کرتے ہوئے اُس کے گرد جمع ہو جائیں اور اُسے اور اُس کے ساتھیوں کو انتخابات میں کامیاب کرائیں — لیکن جمہوریت کا یہ پرستار جب اقتدار پر قابض ہو جائے تو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے تمام آمرانہ اختیارات کے ساتھ حکومت کرنے پر مُصر ہو۔ جو لوگ فوجی انقلاب کے ذریعے حکومت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ بھی اِس امر کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ وہ ایک فوجی آمر کی حیثیت سے مشہور نہ ہوں۔ اِس لیے وہ اپنے آمرانہ اختیارات کو ایک دستور کی صورت دے لیتے ہیں تاکہ اُنہیں ملک کا آئینی سربراہ کہا جا سکے۔ خود ہمارے ملک میں محمد ایوب خاں فوج کے بل بوتے پر اقتدار میں آئے، لیکن انہوں نے ملک کو ایک دستور دے کر جس میں ان کے وسیع اختیارات کا تحفظ تھا، اپنے آپ کو صدر کہلوانا پسند کیا۔

مگر بھٹو صاحب کا معاملہ بالکل جدا تھا۔ اُنہیں انتخابات کے راستے مغربی پاکستان میں ایوانِ اقتدار تک رسائی حاصل ہوئی لیکن جس ذریعے سے اُنہیں آئینی سربراہ بننے کا موقع حاصل ہوا تھا اُس کے بنیادی تقاضوں تک کو نظر انداز کر کے وہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بننے پر بضد ہوئے اور اِسی اندھے بہرے قانون کے تحت مملکت کا نظم و نسق چلانے پر زور دیا۔ اُن کا یہ مطالبہ اگرچہ سراسر غیر معقول تھا لیکن حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے حزبِ اختلاف کو اسے ایک مدت تک کے لیے ناچار تسلیم کرنا پڑا۔

مارشل لاء کے خاتمہ پر ملک کو جو آئین دیا گیا اُسے دیکھتے ہوئے یہ بات بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ یہ آئین، ایک شخصیت اور اُس کے غیر محدود اختیارات کو سامنے رکھ کر مُرتب کیا گیا ہے۔ لیکن اِس حقیقت کو پوری طرح جاننے کے باوجود اُسے متفقہ طور پر محض اس لیے قبول کر لیا گیا کہ کسی طرح یہ ملک آمرانہ استبداد سے نجات حاصل کر کے جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ پھر اِس کے بعد اُس آئین کا بھٹو صاحب اور اُن کے رفقائے کار نے جس طرح حُلیہ بگاڑا ہے اور اُس میں جمہوریت کی جو کچھ رسی سی رُوح موجود تھی اُسے جس ظالمانہ انداز سے آئین کے جسد سے نکالا ہے وہ بڑی ہی کربناک داستان ہے جس نے لوگوں کو خاصا پریشان کر رکھا ہے۔

آمرانہ مزاج اور غیر محدود اختیارات کے ساتھ جب تشدد پسندانہ رجحانات بھی پرورش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پانے لگیں تو اُن سے عوام پر جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں اُن کا ہر شخص بآسانی اندازہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ باقی ماندہ نصف پاکستان میں اختلاف کی ہر آواز کو جو شرمناک مظالم ڈھا کر دبا دیا گیا، وہ اگر درندوں کی طرف بھی منسوب کیے جائیں تو وہ بھی ندامت سے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد، خواجہ رفیق اور دیگر متعدد بے گناہ افراد کی زندگیوں کے چراغ محض رائے کے اختلاف کی بنا پر گل کر دیے گئے۔ سینکڑوں افراد کو اِس جرم بے گناہی کے بدلے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں کہ وہ حاکموں کی ہر بات میں تائید کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ اور جیلوں کے اندر ان کے ساتھ جو حیا سوز سلوک روا رکھا گیا وہ تاریخ کے سیاہ باب کی حیثیت سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

جمہوری ممالک میں جمہوری اداروں خصوصاً اسمبلیوں اور عدالتوں کا تقدس ہر قیمت پر برقرار رکھا جاتا ہے، لیکن بھٹو صاحب اور اُن کے رفقاء نے اُن کے تقدس کو پامال کرنے سے قطعاً گریز نہیں کیا۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں حزبِ اختلاف سے تعلق رکھنے والے ارکان کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا، اُنہیں غنڈہ عناصر کے ذریعے جبری طور پر ایوانوں سے باہر پھنکوایا گیا، وکلاء پر لاٹھی چارج کروایا گیا اور ملک کے عدالتی نظام میں ایسی "اصلاحات" عمل میں لائی گئیں جن سے ایک طرف تو اُن کے اختیارات کا دائرہ کار محدود ہو کر رہ گیا اور دوسری طرف اُن کی آزاد حیثیت بہت حد تک متاثر ہوئی۔

پریس کی آزادی جسے کسی ملک میں جمہوریت کے وجود کی سب سے بڑی شہادت سمجھا جاتا ہے، اُس کا جو حشر ہمارے حکمرانوں کے ہاتھوں ہوا ہے اُس سے یہاں کا ہر شخص واقف ہے۔ پاکستان کے قریب قریب سارے اخبارات، (ایک دو مستثنیات کو چھوڑ کر) محض سرکاری خبرنامے بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ اخبارات صبح و شام بھٹو صاحب کا سیاسی قد کاٹھ بڑھانے اور اُن سے اختلاف کرنے والوں کی کردار کشی میں مصروف رہتے ہیں۔

ووٹ نے بھٹو صاحب کو تختِ اقتدار پر فائز کیا لیکن انہوں نے اپنے جارحانہ طرزِ عمل سے سب سے زیادہ اُس کی تذلیل کر کے اُس کی وقعت عوام کی نظروں میں گرانے کی کوشش کی۔ جس پارٹی کے وہ چیئرمین ہیں اُس میں انتخاب کا اُصول ٹھکرا کر ہائی کمان کی طرف سے مختلف عہدوں کے لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں رکھنے کی کوشش محض خام خیالی ہے۔ جس طرح ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے اسی طرح ہر صاحبِ اقتدار کو مسندِ اقتدار سے محروم ہونا ہی ہے ــــ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کیا یہ طرزِ عمل دانشمندانہ نہیں کہ مقتدر جب یہ دیکھے کہ عوام اُسے مسندِ شاہی پر براجمان نہیں دیکھنا چاہتے تو اُن کے اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کرتے ہوئے اس مسند سے خود بخود الگ ہو جائے اور اس وقت کا انتظار کرے جب عوام اس کے خلا کو محسوس کرتے ہوئے اُسے عزت و احترام کے ساتھ تختِ اقتدار پر دوبارہ فائز کرنے پر اصرار کریں۔

(بقیہ روداد ابتلاء: احمد رائف مصری)

قاہرہ کی مختلف سڑکیں عبور کر گئے۔ میجر نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ وہ ہمیں "اوپر" لے چلے ــ یہی لفظ تھے۔

قلعہ کے برج نمودار ہوئے اور قریب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ میری نظروں میں یوں جھلکنے لگے جیسے کوئی دیو آسمان کو سینگ مار رہا ہو۔ نہ معلوم مجھے کیوں اس وقت یہ محسوس ہوا کہ حضرت عمرو بن العاص کی روح میرے سامنے جلوہ افروز ہے۔ اُس عظیم انسان کی رُوح جس نے مصر کو مشرق کی رومن سلطنت کے مظالم سے نجات دلائی تھی اور اُس عظیم انسان کی برکت سے میں آج مسلمان ہوں۔ اسی وقت مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ اسلام کی رُوح سنگین حالات اور کٹھن آزمائشوں کے باوجود قاہرہ کے در و دیوار پر چھائی رہے گی۔

گاڑی عجیب و غریب ٹیڑھی اور پیچدار سرنگوں کے اندر سے گزرتی رہی اور میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں اب کوئی عام شخص اِدھر اُدھر چلتا نظر نہیں آرہا تھا۔ سرنگیں صرف سپاہیوں سے بھری ہوئی تھیں جنہوں نے رائفلیں اُٹھا رکھی تھیں اور ان کی نوکوں پر چمکتی ہوئی سنگینیں آویزاں تھیں۔ انہوں نے سروں پر آہنی خود اوڑھ رکھے تھے، گویا وہ کہیں جنگ کو جا رہے ہیں۔ ایک دروازے کے پاس ہم پہنچ کر گاڑی سے اُتر گئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میرے ساتھیوں کا سلوک اب میرے ساتھ زیادہ سخت ہوتا جا رہا ہے ــــ ہم ایک ایسی جگہ داخل ہو گئے جیسے ہم کسی پُرانے محل کے اندر کسی قدیم قبر کے اندر داخل ہو رہے ہوں ــــ ہم دراصل قلعہ کی جیل کے دروازے پر تھے۔ اسی جیل نے ایسا خون آشام ڈرامہ دیکھا ہے جو عہدِ گذشتہ میں محمد علی پاشا کے خونی ڈراموں سے بھی زیادہ انسانیت سوز تھا ــــ مجھے یاد ہے کہ اس جیل میں مَیں نے اگلے ہی روز ایک انسان کی لاش اپنے کندھوں پر اُٹھائی تھی جو اس خون آشام ڈرامہ کی بھینٹ چڑھ گیا تھا ــــ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(باقی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطبوعات ادارہ ترجمان القرآن

★ سورۂ الرحمٰن	۲/۲۵	★ دینیات	۶/-
★ سورۂ الحجرات	۲/۵۰	★ خطبات (پانچ حصص)	۱۱/۵۰
★ سورۂ یٰسٓ	۲/۲۵	★ الجہاد فی الاسلام	۲۳/-
★ سورۂ الفتح	۲/۲۵	★ حقوق الزوجین	۸/-
★ سورۂ لقمان	۲/-	★ خلافت و ملوکیت	۱۸/-

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ - لاہور

عبدالحمید صدیقی صاحب کے قلم سے

انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام

(اضافہ شدہ جدید ایڈیشن)

★

الحادِ جدید کے ہر ایک روپ —— سرمایہ داری، اشتراکیت اور فسطائیت —— کا حقیقت پسندانہ تجزیہ —— اور واحد نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کا تعارف۔ صفحات: ۲۲۲ **قیمت**، ۱۳/۵۰ روپے

ناشر:- اسلامک پبلشنگ ہاؤس، ۲ شیش محل روڈ، لاہور

ملنے کے پتے: { ادارہ ترجمان القرآن۔ ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور
منصورہ بک سنٹر، نزد چونگی ملتان روڈ منصورہ لاہور ۱۸

© rasailojaraid.com